R. No. 816067 — Regd. No. 98

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 21
Telegrams
"ANJUMAN"

جلد ۲۲۔ شمارہ ۱۲	ایڈیٹر۔ آل احمد سرور	۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر محمود الٰہی

اُردو میں جدید طرز کا پہلا قصہ

اُردو زبان و ادب کو مغربی رجحانات اور نئے خیالات کا حامل بنانے میں جن تعلیمی اداروں کا ہاتھ رہا ہے، ان میں دلی کالج کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، ماسٹر رام چند، ذکاء اللہ، صلائے عام والے میر ناصر علی اسی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ مولوی کریم الدین بھی جو اپنی "کریم اللغات" کی وجہ سے طالب علموں کے حلقے میں اور تذکرۂ طبقات الشعراء کی بنیاد پر طبقۂ خواص میں مشہور ہیں، اسی کالج کے پروردہ تھے۔ مولوی کریم الدین پانی پت کے رہنے والے تھے مگر دہلوی مشہور ہوئے۔ ان کی پوری زندگی تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلّم میں گزری۔ ان کی تصانیف کی تعداد کم نہیں ہے، تعلیم نسواں سے لے کر تذکرۂ شعراء تک کو انھوں نے موضوع قلم بنایا۔ چونکہ ان کی ہر تصنیف پر شروع سے آخر تک ایک مدرسانہ فضا چھائی ہوئی ہے اس لئے زبان و ادب کے درجۂ اوّل کے رہنماؤں میں ان کا شمار نہ ہوسکا لیکن انھوں نے ایک ایسی تصنیف بھی یادگار چھوڑی ہے جسے بجا طور پر اُردو میں جدید طرز کے قصہ نگاری کا نقشِ اوّل کہا جاسکتا ہے۔

اُردو میں قصہ نگاری کے فن نے داستان سے ناول تک ارتقا کی جو منزلیں طے کی ہیں ابھی تک ان پر اس طرح تحقیقی نظر نہیں ڈالی گئی ہے کہ ان کے اہم نقوش سامنے آجائیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس پہلا قصہ ہے جو بعض اہم فنی خامیوں کے باوصف بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتا ہے اور روایتی قصہ نگاری کے خلاف صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے قصہ نگاری کے جس طرز کو عام کیا یہ ان کا ایجاد کردہ ہے یا اس باب میں کسی کو ان کا پیش رو کہا جاسکتا ہے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ابھی تک بحث نہیں کی گئی ہے اور اگر کی گئی ہے تو یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس طرز کے موجد وہ خود تھے۔

مرآۃ العروس کی اشاعت سے سات سال قبل (۱۸۶۲ء میں) لاہور سے مولوی کریم الدین کی کتاب "خط تقدیر" شائع ہوئی جس کا ذکر فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی نے اپنے تیرھویں خطبے (۷ دسمبر ۱۸۶۳ء) میں اس طرح کیا:

> "حال میں جن مصنفین کی نئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں، ان میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابل ذکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب ان کے نام سے واقف ہوں گے۔ موصوف نے اس سال جو تصانیف شائع کی ہیں ۔۔۔ لاہور سے ایک اور کتاب نکلی جس کا نام "خط تقدیر" ہے۔ یہ کتاب اخلاق پر ہے اگرچہ نثر میں ہے لیکن جابجا اشعار بھی ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر ایک شعر بطور طغریٰ لکھا ہوا ہے"
>
> (خطبات شائع کردہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۳۸۹)

دتاسی نے "خط تقدیر" کے تعارف کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس نے یہ بات نظر انداز کردی کہ اس کا تعلق صنف قصہ سے ہے۔ مولوی کریم الدین نے "خط تقدیر" کا جو دیباچہ لکھا ہے

وہ خود اُردو کے افسانوی ادب کی تنقید کے سلسلے میں بڑا اہم ہے۔ دتا سی نے اس دیباچے سے بھی تعرض نہیں کیا۔

مجھے حال ہی میں "خط تقدیر" کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جو ۱۸۶۹ء میں مطبع پنجابی لاہور میں چھپا تھا۔ اس نسخے کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

"خط تقدیر مترجم، حسب اجازت مصنف، مطابق اس نسخہ صحیح کے جواب کی دفعہ مصنف نے ازسرنو صحیح اور ترجمہ کرکے خود طبع کرائی ہے، واسطے استفادہ طلباء مدارس احاطہ پنجاب کے ۱۸۶۹ء در مطبع پنجابی لاہور باہتمام منشی محمد عظیم مالک مطبع کے چھپی۔"

میں نے سرورق کی یہ عبارت صرف اس لئے نقل کی ہے کہ "مترجم" سے جو غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے وہ دور کردی جائے۔ چونکہ یہ کتاب داخل نصاب ہوچکی تھی اس لئے طلبہ کی آسانی کے لئے مصنف نے متن کے مشکل الفاظ کا ترجمہ حاشیے پر لکھ دیا ہے۔ اسی رعایت سے اس ایڈیشن کو مترجم کہا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مولوی کریم الدین کا طبع زاد قصہ ہے۔

اس کتاب پر مصنف نے طویل دیباچہ لکھا ہے جس کے ضروری اقتباسات یہاں اس غرض سے درج کئے جاتے ہیں کہ مصنف کے نظریے اور کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجائے:

"... مدت سے یہ آہنگ تھی کہ تقدیر و تدبیر کا مضمون بطور قصہ لکھا جائے بشرطیکہ مخالف کسی کے مذہب کے اور خلاف رائے اہل فلسفہ کے بھی نہ ہو اور جو باتیں اس میں درج ہوں وہ اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرح کے ہوں جن کا اثر طبع انسان پر ہو کے بہت نتیجہ پیدا کریں اور کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے اس کو خیال ہو کہ یہ قصہ میرے حسب حال لکھا گیا ہے اور زبان اس قصے کی اردو خاص اور سلیس اور محاورات دلچسپ روزمرہ ٹھیک اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تاکہ اس زمانہ کے طلباء کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب ہو۔

گزارش یہ ہے کہ ایشیائی قصوں کی روش اور طور چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔ اس کی ضرورت اس واسطے دامن گیر ہوئی کہ سات سو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سو برس سے ہندی یا اُردو میں قصہ نویسی کا جو شوق لوگوں کو پیدا ہوا تو اس دن سے آج تک یہ دستور رہا ہے کہ ان مصنفوں نے بادشاہوں یا تاجروں یا فقیروں کی کہانیاں لکھی ہیں اور کوئی قصہ مضامین عشقیہ اور محاورات واجب التعزیر سے خالی نہیں ہے اور جس راہ پر اول مصنف چلا تھا وہی سڑک آج تک جاری ہے۔ کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا۔ ...

... متقدمین اس امر میں (قصہ نویسی کی غرض و غایت سمجھنے میں) معذور ہیں کیونکہ ان کو اس کا تجربہ حاصل نہ تھا اور اس قاعدے سے عموماً مصنفین قصص ایشیا ناواقف محض تھے۔ اگر واقف ہوتے تو اس طور پر نہ چلتے۔ اب اس زمانے میں خوب طرح کھل گیا اور ثابت ہوگیا کہ عام طور تصنیف سابق کا اچھا نہ تھا اس لئے بندہ نے وہ عام طور چھوڑ کر نئے طور سے یہ قصہ لکھا اور کوئی لفظ بیہودہ اس میں نہ آنے دیا تاکہ عورتیں اور مرد دونوں اس کتاب کو پڑھ کر حظ اٹھائیں، پر عشق کے پیرایہ میں اس لئے لکھا کہ بدوں چاشنی عشق کے کوئی کہانی ایسی مزہ دار نہیں ہوسکتی کہ باشندے ایشیا کے اس پر متوجہ ہوں۔

... اگرچہ میں یہ عرض نہیں کرسکتا کہ جس طرز پر میں نے یہ قصہ لکھا ہے یہی طور سب سے اچھا ہے شاید کوئی اور طرز جاذب طبع اور منتج حسنات کسی اور شخص کے ذہن پر ہویدا ہوجاوے پر میری طبیعت نے جو طرز حسب حال اس زمانے کے پسند کی ہے اور جس طور پر یہ قصہ مجھ کو لکھنا پسند آیا وہ یہی طرز ہے جو اس میں برتی گئی۔

... الحمد کہ یہ منصوبہ درمیان ۱۸۶۲ء کے مقام لاہور میں بن پڑا اور اس کے فروغ شان کے واسطے عقل نے یہ رہبری کی کہ بخدمت جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب ... بطور نذرانہ پیش کروں چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد ملاحظہ اور سماعت کے یہ قصہ منظور فرما کر بندہ کو ممتاز اور معزز بندہ کے اقران و اتراب میں فرمایا۔ ..."

مولوی کریم الدین نے روایتی قصہ نگاری کی جس شدت سے مخالفت کی ہے اور نئے طرز کی قصہ گوئی کو رواج دینے کے لئے جس عزم کا اظہار کیا ہے، یہاں ان پر کسی تبصرے کا موقع نہیں ہے کہنا صرف یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے گھر کو پیش نظر رکھ کر نئے طرز کا قصہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی اور مولوی کریم الدین نے پورے معاشرے کی اصلاح کے لئے یہ اقدام ضروری سمجھا۔ مولوی کریم الدین عشقیہ مضامین سے قصوں کو مبرا رکھنا ضروری سمجھتے تھے لیکن ایشیا کے باشندوں کو متوجہ کرنے کے لئے انھوں نے اخلاقی باتوں میں عشق کی چاشنی بھی ملادی تھی اور اپنے قصے کو اس طرح نہ لکھ سکے جیسا وہ دل سے چاہتے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ہماری زبان

۱۲ مارچ ۱۹۶۳ء

ادیبوں کو معاوضہ دیجئے

کسی زبان کے ادب کی ترقی کو پرکھنے کے لئے ایک آلہ یہ بھی ہے کہ اس میں پورے وقت کے ادیب کتنے ہیں یعنی کتنے ایسے ہیں جن کی ساری آمدنی اُن کی تصانیف کے معاوضے پر مشتمل ہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں اُردو ادب کی حالت کسی طرح قابل اطمینان نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت ادب کی سرپرستی کرتی ہے۔ کتابوں پر انعامات دئے جاتے ہیں اور کچھ مشہور اور بزرگ ادیبوں کو پنشن بھی دی جاتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کتب خانے پہلے سے زیادہ تعداد میں اُردو کی کتابیں خریدتے ہیں مگر ان سب باتوں کے باوجود اردو میں ایسے ادیبوں کی تعداد بہت کم ہے جو سنجیدہ اور معیاری ادب کے علمبردار ہیں اور جن کی تمام آمدنی اُن کی تصانیف کی وجہ سے ہے۔ آپ کو ایسے لکھنے والے مل جائیں گے جو چٹ پٹی کہانیاں لکھتے ہیں، ایسے رسالے مل جائیں گے جو مزے دار سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں، ایسے لکھنے والے مل جائیں گے جو جاسوسی ناول لکھتے ہیں اور چونکہ وہ خوب بکتی ہیں اس لئے اچھی خاصی رقم کما لیتے ہیں، مگر ہمیں اس وقت ان سے غرض نہیں۔ ایسے لکھنے والے ہر زبان اور ہر ملک میں ہوتے ہیں جو ادب میں تجارت کے اصول برتتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس اہم اور سنجیدہ اور ٹھوس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ سماج اگر اچھا لکھنے والوں کی سرپرستی نہیں کرتا تو وہ لکھنے کے علاوہ کوئی ملازمت کریں گے، کوئی کام ڈھونڈھیں گے۔ کچھ دن وہ کسی نہ کسی طرح تخلیقی چنگاری کو روشن رکھیں گے اور رفتہ رفتہ حالات کی گرد اس چنگاری کو خاکستر بنا دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالوں میں پہلے اچھے اچھے اور روشن کارنامے نظر آتے ہیں، پھر ان کارناموں کے بعد گوارا کارنامے اور آخر میں ناگوار۔۔۔ ہمارے نزدیک ادیبوں کا قصور اس معاملے میں کم ہے، سماج کا زیادہ۔ اگر اُردو دوستوں کو اپنا ادب عزیز ہے تو انھیں اس محنت کی مناسب قیمت بھی دینی چاہیے۔ مُفت کی کتابیں پڑھنا اپنے اوپر حرام قرار دے دینا چاہیے۔ ہر مضمون نگار کو کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور دینا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی اخبار ضرور خریدنا چاہیے۔ سال میں کچھ کتابیں خریدنا اپنے اوپر فرض کر لینا چاہیے۔ اخباروں اور رسالوں کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ہر شایع شدہ مضمون، نظم، غزل کا معاوضہ دیں۔ انجمن "اُردو ادب" کے مضامین کے لئے معاوضہ دیتی ہے۔ اب "ہماری زبان" کے مضمون نگاروں کو بھی ایک حقیر معاوضہ پیش کیا جائے گا جو ادبی حلقے کی ممبری کی شکل میں ہوگا۔ ان سب باتوں کا التزام ہونے لگے تو لکھنے والوں کی مالی حالت یقیناً بہتر ہوگی اور وہ زیادہ سکون اور اطمینان سے اپنے فن کو نجات کا ذریعہ بنا سکیں گے۔

سیر بین

جس طرح رسالوں کی وبا عام ہے اسی طرح لکھنے والوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف ایڈیٹروں کو خط لکھا کرتے ہیں اور اب رسالوں میں ان کی نگارشات کو ایک خاص درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ عام طور پر ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ ہے ایڈیٹر کی تعریف۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایڈیٹر لوگ تعریف کے قابل نہیں ہوتے، مگر اگلے ایڈیٹر اپنی تعریف خطوں میں دیکھ کر ہی خوش ہوا کرتے تھے، اُسے چھپواتے نہیں تھے۔ خیر تو اس تعریف کے علاوہ ان خطوط کا ڈھرا یہ ہوتا ہے۔ اب کے شمارے کا معیار پچھلے شمارے سے بہتر یا بدتر ہے۔ فلاں مضمون شاہکار ہے۔ فلاں افسانہ گھٹیا معلوم ہوتا ہے۔ فلاں نظم سال کی بہترین نظم ہے اور فلاں غزل بھرتی کی ہے۔ اس شاعری کا مضمون کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ہاں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ ہندوستان میں تجارتی حلقے، سرکاری حلقوں سے ادب کی سرپرستی میں پیچھے ہیں۔ کچھ سرمایہ داروں کی سرپرستی میں ایک بھارتی گیان پیٹھ انعام رکھا گیا ہے جو کسی ہندوستانی ادب کی بہترین کتاب کو دیا جائے گا۔ یہ انعام ایک لاکھ روپے کا ہوگا۔ ریاستی حکومتیں ہزار پانچ سو کا انعام دیا کرتی تھیں۔ مرکزی حکومت نے بڑا تیر مارا تو پانچ ہزار کا انعام ہر زبان کے بہترین ادبی شاہکار پر دینے لگی۔ اب بھارتی گیان پیٹھ ایک لاکھ کا انعام دے گی۔ مگر یہ ابھی معلوم نہیں ہوا کہ اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ بنگلہ زبان کی کتاب، ہندی کی کتاب سے بہتر ہے اور تامل کی کتاب اُردو کی کتاب سے۔ اگر سب کے ترجمے ہندی یا انگریزی میں کرائے جائیں گے تو یہ ترجمے اصل کے معیار کے مظہر کس حد تک ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب بہت اچھی ہو اور ناقص ترجمے کی وجہ سے نظر انداز ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ترجمہ بہت اچھا ہو اور اُس کی وجہ سے کتاب پر انعام مل جائے۔ بہرحال ہماری اہم ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں اس خبر سے گرگری تو پیدا ہو ہی جائے گی۔ یہی کیا کم ہے۔

ابھی امیر خسرو کے عرس کے موقع پر قوالوں کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور ان میں سے ایک کو تو بلبل ہند کا خطاب بھی دے دیا گیا۔ افسوس ہے کہ قوالوں کے مقابلے میں شاعروں کی پوچھ گچھ کم ہی ہوئی۔ حالانکہ اچھے اچھے شاعروں نے اس موقع پر اپنا کلام سنایا تھا مگر کسی کو بلبل چھوڑ کوئل کا بھی خطاب نہ ملا۔ کیا شاعری قوالی سے بھی گئی گزری ہے۔

امام الہند کی یاد میں

حضرت مولانا آزاد کی یاد میں ایک مخصوص ادبی نشست ۱۴ر مارچ کی شام کو زیر صدارت ڈاکٹر تارا چند آزاد بھون میں منعقد ہوئی جس میں ممبران انجمن اور سرکردہ ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ سفرا، وزرا، علم دوست خواتین اور ممبران پارلیمنٹ نے بھی شرکت فرمائی۔

جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے انجمن ترقی اُردو شاخ دلّی کے صدر پنڈت سندر لال نے فرمایا۔ مولانا کی ذات گرامی ہم عصروں سے بہت بلند تھی وہ سچے مومن تھے اور مولانا کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ اپنی زندگی کے اچھے پہلو کو نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اپنوں اور بیگانوں کے طعن و تشنیع عمر بھر برداشت کرتے رہے۔

مولانا کی مبارک زندگی ایک ایسے ریشمی دھاگے کی مانند تھی جس نے کروڑوں انسانوں کو ملا رکھا تھا۔ دراصل سیکولرازم کے معنی مولانا آزاد ہی نے بتائے۔ ہندی والے بھی ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ دلّی کے ایک مشہور ہندی پرچے نے مولانا کی وفات کے بعد کہا کہ اگر مولانا زندہ رہتے تو ہمارے مسائل جلدی سلجھ جاتے۔

ڈاکٹر سید محمود نے فرمایا مولانا آزاد کا دل ایسا بیش بہا موتی تھا جس کی مثال ممکن نہیں، ذہانت و ذکاوت اور یادداشت کے لحاظ سے بھی مولانا کو انفرادیت حاصل تھی۔ قلعہ احمد نگر کی جیل میں اپنی یادداشت کی بدولت سنہ ۱۹۰۶ء کی پہلی ملاقات کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ بات بڑی مایوس کن ہے کہ لوگ مولانا کو بھی بھولتے جاتے ہیں، اس میں حکومت اور عوام دونوں شامل ہیں۔ آج کے ہندوستان میں نہ گاندھی جی کسی کو یاد ہیں نہ مولانا آزاد۔ اور ان دونوں کا بھلا دینا گویا انسانیت سے مُنھ پھیر لینا ہے۔

اجمل خاں صاحب نے جو مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری رہے، کہا کہ مجھے مولانا کے قریب رہنے کا سالہا سال فخر حاصل ہے اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ ان کی کس کس بات کا ذکر کروں اور ان کی بلندی طبع شگفتہ خاطر، ذہانت و جودت کا ذکر کرنے کے لئے کون سے الفاظ لاؤں۔ دراصل قومی ایکتا کے معنی مولانا آزاد ہی نے بتائے، تقریر کے آخر میں اجمل خاں صاحب نے مولانا کے خطبۂ صدارت رام گڑھ کانگریس کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب نے جو ہندوستان کے مشہور مؤرخ ہیں اپنی فاضلانہ صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جب مولانا صاحب وزیر تعلیم تھے تو مجھے اُن کے ساتھ کئی سال تک کام کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اُن کے اوصاف کا بیان کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ مولانا جیسے انسان جہاں اور جس ملک میں بھی پیدا ہوں اُس ملک کے لئے لائق فخر ہوتے ہیں۔ مولانا اعلیٰ درجے کے سیاست داں اور قومی رہنما تھے، اُردو ادب میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اُردو نثر کو انھوں نے نئی راہیں نکال کر ایسی آب و تاب بخشی کہ ان کا نام ہمیشہ دنیائے ادب میں جگمگاتا رہے گا۔ تذکرہ ہو یا غبار خاطر، زبان و بیان ان کے تابع ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا دریا اُمڈتا چلا آرہا ہے۔

مذہبی لحاظ سے بھی ان کو بہت بلند مرتبہ حاصل تھا اور امام الہند کا لقب ان پر سجتا تھا لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے اونچے خیالات کو نہ مسلمانوں نے سمجھا نہ ہندوؤں نے، اور مرتے دم تک مولانا کو یہی صدمہ رہا کہ ملک غلط راہ پر چل رہا ہے اور عوام و خواص میں سے کسی کو بھی ان کے کہنے پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مولانا کو تو سچائی سے محبت تھی وہ دین دھرم کے جھگڑوں سے بہت بلند تھے۔

نشست کے آخر میں پنڈت سندر لال صاحب نے فرمایا کہ ہمارے پاس اکثر یہ شکایت آتی ہے اور خود ہمیں بھی اس کا احساس ہے کہ مولانا کی وفات کو چار سال ہو چکے ہیں لیکن ان کی تصانیف ابھی تک ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے نہیں چھاپی گئیں، اور یہ بڑا افسوس ناک بات ہے۔ اُردو دنیا میں اس وجہ سے بے چینی ہے۔ پاکستان سے یہ تمام تصانیف تقریباً اس عرصے میں چھپ کر آگئی ہیں اور یہاں بھی چھپ رہی ہیں۔

ساغر نظامی نے کہا کہ حکومت اور ساہتیہ اکیڈمی کو آب و تاب کے ساتھ چھاپنے کی طرف جلدی توجہ دینی چاہئے۔ یہاں جو کمیٹی مولانا کی تصانیف پر کام کرنے کے لئے بنائی گئی ہے اس کی اجازت کے بغیر یہاں کتابیں کیوں چھاپی گئیں۔

احمد محی الدین صاحب نے دوسرے مقررین کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ کام جلد ہونا چاہئے، مرکزی انجمن اور شاخ دلّی کو چاہئے کہ اس سلسلے میں وہ ساہتیہ اکیڈمی اور حکومت ہند سے شکایت کریں۔

آخر میں روش صدیقی، ساغر نظامی، انور صابری، بسمل سعیدی اور سلام مچھلی شہری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

(سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو شاخ گلبرگہ

"انجمن کے انتخابات برائے سال سنہ ۱۹۶۳ء و سنہ ۱۹۶۴ء منعقد کئے جا رہے ہیں۔ ۱۵ر مارچ تا ۲۴ر مارچ سنہ ۶۳ء عام رکنیت سازی عمل میں آئے گی۔ پرچہ ہائے نامزدگی کے ادخال کی تاریخ ۲۷ر مارچ سنہ ۶۳ء مقرر کی گئی ہے۔ دست برداری ۲۰ر مارچ سنہ ۶۳ء تک قبول کی جائے گی اور رائے دہی ۳۱ر مارچ سنہ ۶۳ء کو صبح ۸ تا ساعت دو پہر بمقام دفتر انجمن (ہلال منزل) قاضی پورہ ہوگی۔ مزید تفصیلات دفتر انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔"

(م۔ کنوینر انتخابات انجمن)

عمیق حنفی

نوائے وقت

اے دلِ امن خواہ خواب سے جاگ   سرحدوں پر بھڑک اٹھی ہے آگ
وہ بلندی کہ دیکھ کر جس کو   راستے لوٹ لوٹ جاتے تھے
جن ڈھلانوں پہ مست چرواہے   بانسری پر دھنیں بجاتے تھے
سرگمیں جھوم جھوم اٹھتی تھیں   بانس بن سیٹیاں بجاتے تھے
دیو داروں کو وجد آتا تھا   دھان کے کھیت لہلہاتے تھے
ہیم کے پل پگھلتے رہتے تھے   اور تلودوں کو گدگداتے تھے
پگھلی چاندی کے تیز رو جھرنے   جن کے سائے میں گنگناتے تھے
اور بادِ شمال کے جھونکے   جن کے پانی میں بھیگ جاتے تھے
شانۂ برہم پتر کو بادل   اپنے پنکھوں سے تھپ تھپاتے تھے
گاگریں لے کے پدلیوں کے دل   رس کے ساگر جہاں لنڈھاتے تھے

لوگ جاتے تھے اور آنکھوں میں
میٹھے سپنے سمیٹ لاتے تھے

آج اس برف پوش وادی میں   ہو گئے ہیں پہاڑ سر بہ کفن
گولیاں چیخ چیخ پڑتی ہیں   گونج اٹھتے ہیں کوہ و دشت و دمن
سرخ ہے برف اور چٹانیں سرخ   سرخ بادِ شمال کا دامن
ابر خونیں ملار گاتا ہے   رقص کرتے ہیں آتش و آہن
بوئے بارود ہے فضاؤں میں   ناک میں دم ہواؤں میں الجھن
آج اس امن دوست وادی میں   بج رہا ہے بگل پڑا ہے رن
جنگ آمادہ دوست ہیں کہ ہوئے   آپ اپنے ضمیر کے دشمن
آستینوں میں ان کی خنجر تھے   بھائی بھائی کی تھی لبوں پہ رٹن
عقل دشمن ہیں جو بتاتے ہیں   دوستی کو بھی جنگ کا ایندھن

آج تلوار ہے قلم میرا
کاٹتا ہے فساد کی گردن

ملک فولاد بن گیا ہے آج   سخت دشمن سے اپنی ٹکر ہے
آبروئے وطن سلامت باد   تجھ پہ قربان زیور و زر ہے
مادرِ ہند جان و دل ہیں نثار   یہ ہتھیلی ہے اور یہ سر ہے
موجِ گنگ و جمن ہے تیغِ سناں   موجۂ برہم پتر خنجر ہے
آج باقی نہیں دوئی کا نشاں   ملک کا ملک ایک لشکر ہے
ساری تفریق ایک پل میں مٹی   سرحدِ دشمن کے بھی یہ پیکر ہے
دشمنِ شرم سوز تنہا ہے   اس کو خود اپنے آپ کا ڈر ہے
سارا عالم ہمارا ساتھی ہے   حق پرستی ہماری رہبر ہے
پیچھے ہٹتے ہیں آگے بڑھنے کو   جنگ کا ایک یہ بھی تیور ہے

ہم اگر ایک اور نیک بھی ہیں
بس یہ سمجھو کہ معرکہ سر ہے

یوسف حیدرآبادی

رباعی

اے چین سنبھل کہ ہند مجبور نہیں   جم جائیں قدم تو فتح کچھ دور نہیں
لٹتے ہوئے مرجائیں گے ٹیپو کی طرح   ذلت کی مگر زندگی منظور نہیں

مجاہد حسین حسینی

بے نیازی

پیش کرتے ہیں سبھی اب مجھے نذرانۂ دل
جب محبت کی ضرورت تھی محبت نہ ملی
اب تو میں ہوش کی دولت سے بھی بیگانہ ہوں
جب میں باہوش تھا اس وقت یہ دولت نہ ملی

یاد ایام، میں بے تاب رہا کرتا تھا
کہ کوئی کب مجھے "مانوس" اشارہ کر دے
(تو تو میرا ہے۔ فقط میرا) ان الفاظ کے ساتھ
ایک ذرّے کو بلندی میں ستارہ کر دے

حیف صد حیف کہ یہ خواب ادھورا ہی رہا
کس کو فرصت تھی جو کرتا کسی مفلس کا خیال
سب وہاں مست تھے خود بینی و خود کامی میں
کون تھا دیکھنے والا مرا اندوہ و ملال

لیکن اب، میرے اشاروں پہ ہے رقصاں دنیا
جب خدا نے مجھے دنیا سے کیا بے پروا!

غزلیں

عادل منصوری

دروازہ بند دیکھ کے میرے مکان کا   جھونکا ہوا کا کھڑکی کے پردے ہلا گیا
وہ جانِ نوبہار جدھر سے گزر گیا   پیڑوں نے پھول پتوں سے رستا چھپا لیا
اس کے قریب جانے کا انجام یہ ہوا   میں اپنے آپ سے بھی بہت دور جا پڑا
انگڑائی لے رہی تھی گلستاں میں جب بہار   ہر پھول اپنے رنگ کی آتش میں جل گیا

میکش ناگپوری

خیرہ مری آنکھیں تھیں تو ویراں مرا دل تھا   نقشِ کفِ پا اُن کا رشکِ مہِ کامل تھا
جینے کی تمنا میں مرنا ہی پڑا آخر   تقدیر سے وابستہ حالِ دلِ بسمل تھا
اس شوخ کے آنے تک ہر جنبشِ لب مشکل   مانا مرے سینے میں موجود مرا دل تھا
بے خوف و خطر میکش ٹکرا گیا میں غم سے   سینے میں مرا دل تھا یا جذبہ کامل تھا

نکہت بریلوی

اب اس کی یاد ستانے کو بار بار آئے   وہ زندگی جو ترے ہجر میں گزار آئے
یہ بے بسی بھی نہیں لطفِ اختیار سے کم   خدا کرے نہ کبھی دل پہ اختیار آئے
قدم قدم پہ گلستاں کھلے تھے رستے میں   عجیب لوگ ہیں ہم بھی کہ سوئے دار آئے

جنوں کو اپنے گریباں سے کیا ملے گا کہ ہم
یقین ہو ہم گل بھی پیرہن اتار آئے

بنسی لال

اُردو رسم الخط مختصر و مدلّل اور صوت کے اصولوں پر مبنی ہے

اُردو کے طریقۂ تحریر میں یہ خوبی ہے کہ یہ بہت جلد لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ سادہ اور آسان ہے اور تحریر میں بہت کم جگہ لیتی ہے۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) اس کے حروف بہت سادہ ہیں۔ ایک ہی اُفقی خط 'ـــ' چھ مختلف حروف ب پ ت ث ٹ بناتا ہے۔ ایک ہی سادہ گھیرے ح سے چار حروف ج چ ح خ وجود میں آتے ہیں۔ ان کا باہمی امتیاز صرف نقطوں کی تعداد اور ان کے محل وقوع سے پیدا ہوتا ہے (ب) تمام حروف قلم کی ایک ہی جنبش سے یعنی ایک ہی جھٹکے سے لکھے جاتے ہیں مثلاً ج س ق ل م وغیرہ میں سے ہر ایک ایک سرے سے شروع کرکے دوسرے سرے تک بغیر قلم اٹھائے لکھا جاتا ہے اور صرف نقطے ڈالنے کے لئے ہی قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ (ج) الفاظ کی بناوٹ میں حروف ابتدائی اور درمیانی جگہ پر مزید مختصر شکلیں اختیار کرتے ہیں جیسے چ حرف چل اور بچل الفاظ کے بتدریج شروع و درمیان میں ایک چھوٹی سی شکل چـ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح س سبق اور مست میں سـ شکل۔ اور ف فائدہ اور سفید میں 'فـ' مختصر شکل لیتا ہے۔ (د) ایک ہی جھٹکے سے لکھی جانے والی خوبی نہ ہی صرف حروف میں بلکہ الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے جیسے بنفشہ لفظ کا ڈھانچہ 'سعسہ' ایک سرے سے دوسرے سرے تک قلم کی ایک ہی جنبش سے لکھ ڈالا جاتا ہے صرف نقطوں کے لئے ہی قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ اُردو مختصر نویسی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

لیکن اُردو کی اس مختصر نویسی کا فائدہ تو تبھی اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کی طرز تحریر پر عبور حاصل ہو جائے۔ لیکن اسے سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ رومن ہندی وغیرہ رسوم الخط ہفتہ عشرہ میں سیکھی جاسکتی ہیں لیکن اُردو سیکھنے میں مہینوں کی سخت محنت درکار ہوتی ہے۔ کیوں؟ اس کے لئے ذیل کی وجوہات ذمہ دار ہیں۔ (۱) ہر ایک تحریر میں دو قسم کے حروف مستعمل ہوتے ہیں۔ حرکات (Vowels) اور سکنات (Consonants)۔ ان دونوں میں حرکات زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان کے بنا لفظ کیا اس کا ایک جز بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ کوئی بھی ساکن بنا حرکت کے متحرک نہیں ہوسکتا، یعنی اپنی آواز نہیں دے سکتا۔ لیکن حرکات بغیر کسی حرف ساکن کے بھی لفظ بنا سکتے ہیں جیسا 'آ' (فعل امر)۔ دو حرکات کے میل سے 'آئے' (ماضی مطلق) الفاظ بن جاتے ہیں لیکن کوئی بھی حرف ساکن کسی حرکت کے میل کے بنا کوئی لفظ نہیں بنا سکتا۔

تو ایسے اہم کردار ادا کرنے والے حروف حرکت کا اردو کے ابجد میں فقدان ایک ایسا نقص ہے جو کہ تحریر سکھانے میں بھاری رکاوٹ کا موجب ہے۔ مثلاً اُردو کی طرز تحریر میں اور جو حرکت استعمال میں آتی ہیں لیکن ابجد میں انھیں کہیں جگہ نہیں دی گئی وہاں صرف ایک سیدھا خط ا (الف) آتی ان سب کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن یہاں بعد میں ثابت کیا جائے گا کہ یہ الف ایک بے آواز خط ہے جو کہ اصلی حرکات کو ان کی علاوہ دوسری (غیر ابتدائی) جگہ دینے کے کام آتا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور کردار نہیں۔ حرکات کی ابجد میں غیر حاضری کی وجہ سے ہی لفظوں کی بناوٹ سکھاتے وقت مبتدیوں کو ہر لفظ میں استعمال شدہ حرکت کی ترکیب سمجھانی پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ 'اَب' سکھانے کے لئے طلبہ کو پہلے اَ کی بناوٹ بتلائی ہوتی ہے یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ الف اور زبر مل کر اَ بنتا ہے۔ پھر اس اَ کے ساتھ ب ملانے سے اَب لفظ کی تکمیل ہوتی ہے۔ مبتدیوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ بچو پڑھو الف زبر اَ۔ بے موقوف اَب۔ یا الف زبر بے اَب اور غریب طلبہ بنا کچھ سمجھے بوجھے اُستاد کی تقلید کرتے ہوئے طوطے کی طرح اسی کو دوہرا دیتے ہیں۔ لیکن اگر اَ حرف اس کی الف اور زبر سے بناوٹ کو نظرانداز کرکے صرف ایک سادہ حرف ابجد میں رکھ دیا جاتا اور اس کی آواز پر ہی اس کا نام اَ (अ ہندی۔ a رومن) بنایا جاتا تو بچے کو اَ اور ب دو آوازوں کو ملانے سے اَب کی بناوٹ بہت جلد سمجھ میں آجاتی۔

یعنی	اَ	+ ب	= اَب	پس بنے بنائے اور لفظوں میں مستعمل ہونے کو تیار حروف حرکت کی ابجد میں موجودگی بہت ضروری ہے
(ہندی)	अ	ब	अब	
رومن	a	b	ab	

(ب) ابجد میں سکنات کے نام ان کی آوازوں پر نہیں رکھے گئے۔ مثلاً ج کا نام جیم اور اس کی آواز جَ ہے۔ ن کا نام نون اور آواز نَ (न n) ہے یہ نام اور آواز کا اختلاف بھی اُردو سیکھنے میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ (س) تحریر میں ایک ہی حرف مختلف حالات میں مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے جیسے ب حرف بن بج اور لبس میں تین شکلیں بـ ـبـ اور ـب لیتا ہے لیکن کہیں بھی مبتدی کو نہیں بتایا جاتا کہ کن حالات میں وہ فلاں شکل اختیار کریگا۔ اسی طرح ے حرف کہیں ے کہیں ئے کہیں اے (ایک میں) اور کہیں اَیـ (اَیت۔ اتوار میں) اور کہیں یہ ساکن (جیسے یک میں) بن جاتا ہے۔ ان شکلوں اور ساتھ ہی آوازوں کی تبدیلی ایک مبتدی کے لئے باعث پریشانی ہے۔ (د) دیگر اُردو ابجد میں تقریباً ایک ہی آواز والے کچھ حروف ہیں۔ جیسے ت ط ۔ ہ ح ۔ س ث ص ۔ ذ ز ض ظ ۔ ان کی آوازوں میں امتیاز ہے۔

لیکن بغیر اس امتیاز کے بتائے کوئی بھی ہندی املا ٹھیک نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے ان حروف کا باریک امتیاز سمجھانا بھی ضروری ہے۔

میں نے اپنی عمر بھر کی لمبی کھوج سے ان تمام نقائص کو دور کیا ہے۔ اور اُردو تحریر کو صوت کے اصولوں پر قائم کر کے اسے ہندی اور رومن کے بالکل متوازی بنا دیا ہے۔ نیز الف، ہمزہ، نون غنہ، جزم، تشدید، واوٗ معدولہ تنوین وغیرہ کی ماہیت اور کردار کی بہت دلچسپ وضاحت پیش کی ہے۔

میری یہ سکیم صرف دلیل اور عام سوجھ بوجھ پر قائم کی گئی ہے اس لئے کوئی بھی شخص جو اُردو پڑھنا اور لکھنا جانتا ہے اسے آسانی سے سمجھ سکے گا۔

سکیم ۔ اُردو کا صوتی ابجد

	چھوٹی حرکات				نہ بدلنے والی لمبی حرکات			بدلنے والی لمبی حرکات		
اُردو حرکات	اَ	اِ	اُ	آ (اا)	او	اَو	اُو	ے	اَے	اِی
متوازی ہندی حرکات	अ	इ	उ	आ	ओ	औ	ऊ	ए	ऐ	ई
متوازی رومن حرکات	a	i	u	aa	o	au	oo	e	ai	ee

سکنات (ب جماعت) ب بھ پ ن ت ٹ ث ٹ

ہندی	ब	भ	प	न	त	स	ट
رومن	b	y	p	n	t	s	t

(ج جماعت) ج چ ح خ م

ज च ह ख म

j ch h kh m

(س جماعت) س ش ص ض ط ظ ع غ و ف ق

स श स ज़ त ज़ अ ग़ व फ़ क़

s sh s z t z a gh w f q

(ل جماعت ۔ ہ ۔ و جماعت) ل ک گ ۔ ہ ۔ ے

ल क ग ह

ڈ ڈ ر ڑ ز ژ

द ड ज़ र ड़ ज़ य

(بھاری ہندی حروف) بھ پھ تھ ٹھ دھ ڈھ جھ

भ फ ल्ह थ ठ झ छ

ڈھ دھ ڈ ھ گھ کھ لھ

ल्ह ख ध घ ढ ढ़

نوٹ ۱۔ تمام حروف اپنے متوازی ہندی حروف کی طرح پڑھے جائیں گے۔ مثلاً 'ا' ایک سادہ حرف ہے جس کی آواز अ ہے۔ اس کا ہجہ الف + زبر بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُو ایک بنا بنایا حرف باآواز (ऊ = oo) ہے اور اسے الف پیش واؤ کا مرکب نہیں بتایا جائے گا۔ اسی طرح ن ۔ کا نام نَ (न) ہے نون نہیں ۔ س کا نام سَ (स) ہے سین نہیں ۔ علیٰ ہذا القیاس۔

نوٹ ۲۔ چونکہ تمام سکنات گونگے حروف ہیں ۔ جو کہ بغیر کسی حرکت کے ملاپ کے اپنی آواز نہیں دے سکتے اس لئے تمام سکنات کو ایسے پڑھا جائے گا گویا ان کے ساتھ اَ حرکت لگی ہو۔ جیسے بَ ۔ نہ کہ بے وتَ نہ کہ نون دمَ ۔ نہ کہ میم۔

جب ہندی مندرجہ بالا ابجد کو اچھی طرح سیکھ جائے تو الفاظ کی بناوٹ اس کے لئے ویسی ہی آسان ہو جائے گی جیسے کہ جبر و مقابلہ میں سادی مساوات۔ جیسے

(الف) ابتدائی حرکات

اَ + ب = اَب　　اِ + ن = اِن

अ　ब　अब　　इ　न　इन

a　b　ab　　i　n　in

اُ + س = اُس　　آ + م = آم

उ　स　उस　　आ　म　आम

u　s　us　　aa　m　aam

او + س = اوس　　اَو + ر = اَور

ओ　स　ओस　　औ　र　और

o　s　os　　au　r　aur

اُو + ن = اُون

ऊ　न　ऊन

oo　n　oon

اصول نمبر ۱ ۔ جب اے جماعت کے حروف (اے ۔ اَے ۔ اِی) کے بعد میں کوئی حرف آ جائے تو اِن کے گھیرے سے دور کی اپنی درمیانی شکل 'یہ' اختیار کر لیتے ہیں لیکن اُن کی آواز نہیں بدلتی ۔ جیسے

اے + ک　　اَے + ت　　اِی + کھ

ایہ + ک　　ایَہ + ت　　اِیہ + کھ

ए　क　ऐ　त　ee　kh

= ایک　　= اَیت (پنجابی ۔ اتوار) = ایکھ

एक　ऐत　eekh

غیر ابتدائی حرکات

حرکات کو بغور دیکھو۔

اَ اِ اُ آ (اا) او اَو اُو ۔ ے اَے ۔ اِی

ان سب کے شروع میں ایک سیدھا خط (الف) لگا ہے اگر اس الف کی اپنی کوئی آواز ہوتی تو وہ سب حرکات میں مشترکہ پائی جاتی ۔ لیکن یہ بات نہیں ۔ ہر ایک حرکت کی

آواز مختلف ہے اور اس میں کچھ بھی مشترک نہیں۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی الف بے آواز ہے اور اصلی آواز دینے والی حرکات وہ شوشے یا گھیرے ہیں جو ابتدائی الف کے بعد لگے ہیں۔

مثلاً اَ میں अ آواز دینے والی اصلی حرکت ـَ ہے اور ابتدائی الف نہیں۔ اسی طرح او میں اصلی حرکت ـو ہے جس کی آواز 'o' ہے اور ابتدائی الف کی کوئی آواز نہیں۔ اسی طرح اُو میں ـُو کی آواز ऊ ـ oo ہے۔ پس اصلی حروف حرکات یہ ہوئیں۔

ـُو	ـوَ	ـو	ـا	ـُ	ـِ	ـَ
ऊ	औ	ओ	आ	उ	इ	अ
oo	au	o	aa	u	i	a

ـی	ـَے	ـے
ई	ऐ	ए
ee	ai	e

ابتدائی الف کے بے آواز ہونے کا مزید ثبوت

(i) او = o	پہلی مساوات میں او = o ہے
(ii) دو = do	اور دوسری میں دو = do ہے
(iii) دو - د = o	اگر اس میں دونوں طرف سے

د - d ہٹا دیا جائے تو پھر تیسری مساوات بچ جاتی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف واؤ کی آواز 'o' ہے۔

لیکن یہ واؤ پہلی مساوات میں بھی موجود ہے، اس لئے وہاں بھی o آواز صرف اسی واؤ کی ہے اور ابتدائی الف بے آواز ہے۔ اسی طرح

(i) اے = e	(i) آ = اا = aa
(ii) دے = de	(ii) لا = laa
(iii) ـے = e	(iii) ـا = aa

یہاں ا + ا مل کر آ بنتا ہے۔ دوسرے الف کی آواز aa ہے پہلے کی کچھ نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حرکات میں ابتدائی الف بے آواز ہے تو یہ لگایا کیوں جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُردو میں اصلی حرکات اتنی کمزور واقع ہوئی ہیں کہ یہ ہمیشہ غیر ابتدائی (دوسری) جگہ پر لکھی جاتی ہیں۔ اور ابتدائی جگہ پر یعنی شروع میں کبھی نہیں لکھی جاتیں۔ اگر ان سے پہلے کوئی حرف ساکن موجود ہو تو قدرتی طور پر ان کو اپنی مطلوبہ دوسری جگہ مل جاتی ہے۔

جیسے د + و = دو لیکن اگر شروع میں کوئی حرف ساکن موجود نہ ہو تو ایک بے آواز فرضی خط ان کے پہلے لگا کر مصنوعی طور پر حرکات کو ان کی مطلوبہ دوسری جگہ دی جاتی ہے۔ جیسے

(i) دو = do
(ii) ـو = o

یہاں پہلی مساوات میں د موجود تھا اور اصلی حرکت 'و' کو قدرتی طور پر دوسری جگہ مل گئی۔

لیکن جب اس میں 'د' ہٹ جائے تو اس کی ابتدائی جگہ خالی رہ جاتی ہے جسے ایک dash کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ چونکہ اصلی حرکت 'و' اپنی کمزوری کی وجہ سے پہلی جگہ پر لکھی نہیں جاسکتی اس لئے پہلی جگہ خالی رہی۔ لیکن تحریر میں یہ جگہ خالی رکھنا شایاں نہیں اس لئے خلا کو بتانے والی dash ہی گھوم کر سیدھی کھڑی ہوجاتی ہے اور ایک فرضی حرف کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جیسے

(i) ـو = o
(ii) او = o

پس کسی ساکن کے بعد اصلی حرکت استعمال میں آتی ہے اور فرضی خط الف کی ضرورت نہیں رہتی۔

لہٰذا۔

د + و = دو	س + وو = سو
do o d	Soo oo S
ک + ے = کے	د + ی = دی
Ke e K	dee ee d
ر + َ + ب = رب	د + ـِ + ن = دِن
rub b u r	din n i d

س + ُ + ن = سُن
Sun n u S

(باقی)

اقبال کرشن

جنگِ آزادی کا ترانہ

نیتاجی بجا طور پر ہندوستان کے پہلے سپہ سالار تھے، اور ان کی فوج "انڈین نیشنل آرمی" کا جنگی ترانہ ہمارا پہلا جنگی ترانہ ہے۔ اب جب کہ ہم لوگ جنگی حوصلوں سے سرشار ہیں، ہمیں ایک نظر اس جنگی ترانے پر ڈال لینا چاہیے تاکہ ہمارے حوصلوں کو مزید تقویت پہنچے۔ واضح رہے کہ یہ جنگی ترانہ اُردو زبان میں تھا۔

قدم قدم بڑھائے جا
خوشی سے گیت گائے جا
یہ زندگی ہے قوم کی
تو قوم پر لٹائے جا
تو شیرِ ہند آگے بڑھ
مرن سے پھر بھی تو نہ ڈر
آسمان تک اُٹھا کے سر
جوشِ وطن بڑھائے جا
تیری ہمت بڑھتی رہے
خدا تیری سنتا رہے
جو سامنے تیرے چڑھے
تو خاک سے ملائے جا
چلو دہلی پکار کے
قومی نشاں سنبھال کے
لال قلعہ پہ گاڑ کے
لہرائے جا لہرائے جا

مراسلہ

"انیسویں صدی کے چند اکبرآبادی رسائل و اخبار"

مطبوعہ ہماری زبان مورخہ ۱۵ر فروری سنہ ۱۹۶۳ء کے ذیل میں راقم سطور نے "مرزا فدا حسین" کو "دامن بہار" کا ایڈیٹر بتایا ہے جس کا حوالہ دینا سہواً رہ گیا۔ یہ واقفیت "شاعر آگرہ نمبر" مطبوعہ سنہ ۱۹۳۶ء سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح "خیالِ یار" کا مصرع طرح اندراج سے رہ گیا تھا جو یہ ہے: ع
باقی آنکھوں کا فقط ہوا ہے پردا کیا ہے

(۱) آگاہ (۲) راقم (۳) اور عاشق تلامذۂ غالب نیز (۴) ظہیر تلمیذ ذوق کے پتے غزلیات مطبوعہ رسالہ "خیالِ یار" کے عنوانات میں بالترتیب حسب ذیل مندرج ہیں:

(۱) "ساکن حال جے پور، محلہ موتی کٹرہ"
(۲) "جے پور، بلند جاہ"
(۳) "تھانہ دار علاقہ ریاست اودے پور، ملک میواڑ"
(۴) "جے پور، محلہ موتی کٹرہ مکان منور علی کمیدان"

راقم نے شاعر آگرہ نمبر کے لئے "مجریہ سنہ ۱۹۳۶ء" لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ماہنامہ شاعر کا سال اجراء سنہ ۱۹۳۶ء ہے۔ جو بظاہر صحت سے بعید ہے۔ کیونکہ نامبردہ رسالہ کا سال اجرا سنہ ۱۹۳۰ء ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں تو اس کا "آگرہ نمبر" منطبع ہوا تھا۔ یہ وہی مشہور ماہنامہ ہے جو مدتوں "قصرالادب آگرہ" سے علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی زیر نگرانی اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے اور اب بمبئی سے زیر ادارت جناب اعجاز صدیقی شائع ہو رہا ہے۔ "شاعر آگرہ نمبر" میں آگرے سے متعلق مصنفین و ادباء اور شعرائے کرام نیز ان کے کارناموں کا خصوصی بیان ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی رسالہ آگرے کے متعلق یکجائی اتنی واقفیت بہم نہیں پہنچاتا۔

(سراج دھولپوری)

امیر خسرو کو خراج عقیدت

نئی دہلی میں ۱۷ مارچ کو مرکزی وزیر رسل و رسائل شری جگ جیون رام نے کل یہاں حضرت خواجہ امیر خسرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو صرف اُردو زبان یا مسلمانوں کے نہیں تھے بلکہ دنیا کی دولت تھے۔ انھوں نے کہا ہندو اور مسلمان سب یہاں جمع ہیں۔ انھیں ان کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے اور ان سے سبق لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

شری جگ جیون رام بستی نظام الدین میں امیر خسرو کے ۶۵۰ ویں عرس کی آخری مجلس میں تقریر کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ مرکزی وزیر شہری ہوا بازی شری احمد محی الدین اور ہندوستان میں ترکی کے سفیر بھی اس تقریب میں موجود تھے۔

شری جگ جیون رام نے کہا کہ ہندوستانی کلچر ایک مشترکہ کلچر ہے اور آج جو کچھ ہمارے ہندوستان میں ہے وہ ہر ایک ہندوستانی کا ہے۔

قومی اتحاد پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سبھی مذہبوں کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ اور دنیا کا کوئی مذہب آپس میں لڑائی نہیں سکھاتا۔

نائب وزیر شہری ہوا بازی شری احمد محی الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ امیر خسرو ایک ایسی بڑی ہستی تھی جس نے شاعری، موسیقی اور مختلف فنون میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

شری احمد محی الدین نے جو خسرو اکیڈیمی کے سکریٹری بھی ہیں مزید کہا کہ یہ اکیڈیمی امیر خسرو کے دوہے اور اشعار جمع کرنے ان کے بارے میں تحقیق کرنے اور انھیں شایع کرنے کے لئے قایم کی گئی ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔

جمکھنڈی میں یوم آزاد

آزاد لائبریری (بیجاپور) کے زیر اہتمام ۹ مارچ ۶۳ء کو یوم آزاد منایا گیا، عبدالرحیم صاحب سول جج بیجاپور نے صدارت فرمائی۔ اس موقع پر لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح بھی کیا گیا۔ صدر لائبریری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر جلسہ سے درخواست کی کہ وہ لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح فرمائیں۔ بعد ازاں سکریٹری آزاد لائبریری نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھی جس میں عبدالرحمٰن خاں لکچرار ایس، ٹی، کالج بلگام نے مولانا آزاد کے متعلق ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ شام راؤ واٹوے ایڈیٹر نو ہند (جمکھنڈی)، قاضی سراج الدین تالیکوٹ (مدیر رفیق)، حبیب الدین بخشی اور غلام نبی بالسنگ سابق صدر انجمن ترقی اردو بیجاپور نے بھی مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ نے مولانا آزاد کی قوم پرستی و بے باکی کو سراہتے ہوئے سامعین کو تلقین کی کہ وہ مولانا کی بتائی ہوئی راہ پر عمل پیرا ہوں۔

یوم آزادی کے سلسلے میں ایک غیر طرحی محفل شعر و سخن بھی منعقد ہوئی۔ محول اور جمکھنڈی کے قرب و جوار سے بہت سے شعراء نے شرکت کی۔

پاتور میں "انجمن اُردو ادب" اور "آزاد لائبریری" کا قیام

پاتور (ضلع آکولہ) کے نوجوانوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لئے "انجمن اُردو ادب" کے نام سے ایک انجمن تشکیل کی ہے جس کے تحت ایک "آزاد لائبریری" بھی قائم کی گئی ہے اس کا افتتاح قاضی محمد ابراہیم علی صاحب نے فرمایا۔

افتتاحی جلسے کی صدارت قطب الدین صاحب نے فرمائی۔ جناب قاضی محمد علی صاحب وکیل نے اُردو زبان کی اہمیت پر تقریر فرمائی اور جناب صابر نے مالی امداد کی ضرورت کو واضح کیا۔ حاضرین نے (علاوہ کتابوں کے) تقریباً پونے تین سو روپے عطیہ دینے کا وعدہ فرمایا جس میں سے کچھ رقم نقد بھی دی گئی۔ (جہانگیر جوہر سکریٹری)

انجمن معین الادب سہسرام کا سالانہ جلسہ

انجمن معین الادب سہسرام کا سالانہ جلسہ ۱۰ مارچ ۶۳ء منعقد ہوا۔ جس میں کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے مجلس عاملہ کے ممبران و عہدہ داران انجمن کا انتخاب سنہ ۱۹۶۳ء کے لئے عمل میں آیا۔

شاعرستان حیدر آباد

۸ [illegible] سنہ ۶۳ء کو شاعرستان کا ادبی اجلاس و مشاعرہ ہوا جس کی صدارت شری کالی چرن گپتا راہی نے کی۔ شعراء نے کلام سنایا۔ ایک ریزولیشن بحکم بلدیہ کو دیا گیا کہ فصاحت جنگ جلیل مرحوم کی یادگار میں حسب نشاندہی جلیل روڈ کی منظوری کونسل سے حاصل کر کے جلیل روڈ کا اعلان کیا جائے۔

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر "جنرل سکریٹری" انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے پتہ پر فرمایئے۔

بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے پر ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بر وقت نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے پتے پر بھیجیں۔ شکریہ

ضروری اطلاع

اگر آپ کے پتے کے اوپر سرخ نشان ہے تو سمجھئے
یہ سرخ علامت ہے کہ آپ کی
میعاد خریداری ختم ہو جائے گی مہربانی فرما کر
ہماری زبان کی سالانہ قیمت
منی آرڈر سے بھیج کر سلسلہ جاری رکھیئے
منیجر

از ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی

خوشتر تخلص، منشی جگن ناتھ نام، منشی سنالال کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں پیدا ہوئے اور یہاں ہی تعلیم و تربیت پائی۔ ان کے بزرگوں کا وطن قصبہ ٹپہ ضلع اناؤ تھا۔ خوشتر واجد علی شاہ کے دفتر میں متصدی تھے۔ ۱۸۶۳ء میں وفات پائی "رامائن خوشتر" کے علاوہ شریمد بھاگوت منظوم اور مثنوی چترگپت جس کا نام پرم پوتھی ہے آپ کی یادگار ہیں۔ "رامائن خوشتر" جو مثنوی میں ہے اس کا کچھ انتخاب ۱۹۰۸ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے کورس میں شامل کر لیا تھا لیکن اب ہمارے جدید تذکرہ نویسوں نے آپ کا ذکر نظر انداز کر دیا ہے۔ محمد سلیم صدیقی لکھنؤ یونیورسٹی، اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد یونیورسٹی بابت ۱۹۲۸-۲۹ء کے صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں:

"جگن ناتھ خوشتر نے دوسری بار رامائن کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا جو آپ کی شیریں کلامی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بھاگوت اور مثنوی چترگپت کا ۱۲۷۶ھ میں سنسکرت سے منظوم ترجمہ کیا۔ زبان صاف اور شستہ ہے جس میں نہ سنسکرت کے الفاظ کو دخل ہے نہ بھاشا کی کھپت، کلام پر استاد غالب کا اثر غالب ہے۔"

حضرت عشرت لکھنوی مرحوم "ہندو شعرا" میں صفحہ ۵۲ اور ۵۳ پر لکھتے ہیں:

"منشی جگن ناتھ ولد منشی سنالال کایستھ لکھنوی آخری شاہ اودھ کے دفتر میں متصدی تھے ان کی تصنیف سے "رامائن خوشتر" "شریمد بھاگوت" اور مثنوی چترگپت اردو نظم میں مشہور کتابیں ہیں۔ غدر کے سات برس کے بعد ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔"

خوشتر کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ہندو گھر میں جن کی مادری زبان اردو ہے "رامائن خوشتر" ضرور ملے گی۔ رامائن خوشتر پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع منشی نول کشور میں چھپی اور اس کے بعد اس کے سولہ (۱۶) ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ سولھواں ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ یہ رامائن شائع ہوئی، تو نسیم دہلوی نے یہ تاریخ کہی: ؎

عیسوی تاریخ لے فکر رسا
لکھ "چھپے خوشتر کے افکار بجا"

اردو کے مثنوی نگاروں میں میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، احمد علی شوق قدوائی، مرزا شوق، جگر بریلوی، برق سیتاپوری، راحت کاکوروی، فرحت اور منشی سول چند منشی کافی مشہور ہیں لیکن اس صنف سخن میں ان کی شہرت مثنوی رامائن خوشتر کے پیش نظر کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ یہ مثنوی ان کا کارنامہ سمجھنا چاہیے اور اس کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہو سکتا ہے۔ سلاست زبان، پختگی بیان، بندش کی چستی اور شگفتہ طرز بیان میں یہ مثنوی لاجواب ہے۔ منظر نگاری اور واقعات نگاری کے دل کش اور اثر آفریں نمونے اس میں ملتے ہیں۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

ہوا جب مطلع خورشید روشن
گلستان جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارض حور
رخ عالم پہ چمکا پرتو نور
اڑا زاغ سیاہ شب جہاں سے
ہمائے روز نکلا آسماں سے
ہوئی قوس ہلال شب شکستہ
عروس صبح نکلی دست بستہ
فلک پر شاہ خورشید آیا
در شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوا بیدار، شاہ بخت بیدار
شہنشاہ جنک پور نیک کردار
شہ روشن جبین و ماہ سیما
ہوا تخت شہی پر جلوہ فرما
کہا بزم شہاں آراستہ ہو
مکان خسروی پیراستہ ہو
شہنشاہ آج ہوں سب رونق افروز
کہ ساعت اشرف فرخ ہے امروز
بحکم شاہ تب باشان و شوکت
ہوئے مصروف سب ارکان دولت
ہزاروں زود کار و تیز فراش

ہوئے حاضر ادب سے شاد و بشاش
ہزاروں خیمۂ سنجاب و قاقم
کہ عقل چرخ اطلس جس میں ہو گم
کئے آراستہ میدان میں ہر جا
قرینے سے بہ آئین مصفا
ہزاروں شامیانے پرنیانی[1]
کبودی اور خوانی و زعفرانی
کئے آراستہ درجے بدرجے
صفائی سے ہر اک خیمے کے آگے
بچھایا اس میں فرش شال و دیبا
جو تھا اس خیمۂ رنگیں کو زیبا
مرصع سیکڑوں سونے کے دنگل[2]
زر و یاقوت و نیلم سے مکلل
بچھے زریں ہزاروں تخت و کرسی
کہ ترسیں بیٹھنے کو جس پہ قدسی
ہوا آراستہ جب سب یہ ساماں
ہوا خوش دیکھ کر یوں شاہ دوراں
جنک پور میں جو وارد تھے شہنشاہ
کیا سب کو شہ نوبت نے آگاہ
وفور شوق سے بے صبر و طاقت
شتاباں آئے سوئے بزم عشرت
ہر اک کو شاہ باتعظیم لایا
بہ عزت کرسئ زر پر بٹھایا
رعایا شہر کی بہر تماشا
ہوئی دربار شہ میں جمع ہر جا
بٹھایا شہ نے باتکریم سب کو
مناسب کی جگہ تقسیم سب کو
بہ لطف شاہ کم کوئی نہیں تھا
جو ادنیٰ تھا وہاں کرسی نشیں تھا

[1] پرنیاں: ایک قسم کا بیش قیمت ریشمی کپڑا۔
[2] ایک طرح کی بڑی کرسی۔

بقیہ - اردو میں جدید طرز کا پہلا قصہ

غالباً ان سطور کے پڑھنے والوں کے سامنے "خط تقدیر" کا متن نہیں ہے اس لئے یہاں اس کا تنقیدی جائزہ لینا مناسب نہیں ہے اس قصے کا صرف تعارف کرانا مقصود ہے اور تعارف کے سلسلے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک تمثیلی ALLEGORICAL افسانہ ہے جس کے کردار تدبیر، عقل، اتفاق، کفایت شعاری، آمدنی اور خرچ وغیرہ ہیں لیکن ان کرداروں کی مدد سے مولوی کریم الدین نے جو فضا تیار کی ہے وہ وہی ہے جس میں وہ سانس لیے رہے تھے۔ مصنف کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہم جسے تقدیر کہتے ہیں وہ دراصل تدبیر کا دوسرا نام ہے۔ ہر دور میں وقتی اور کامیاب زندگی گزارنے کے لئے انسان نئی نئی تدابیر اختیار کرتا ہے آج جبکہ انگریز ہمارے حکمراں ہو گئے ہیں، ہم کو زندگی کا چلن ان سے سیکھنا چاہئے اور تعلیم و تربیت اور تہذیب و تمدن کے باب میں روایتی نقطۂ نظر ترک کر دینا چاہئے۔ یہ قصہ جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، ان مسائل سے بحث کرتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستانیوں کو پیش آئے۔ اس تمثیل کا اہم کردار طالب تقدیر ہے جو زمانہ شبینہ اور سکون قلب کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ محنت کرنے کے بجائے ملکۂ تقدیر سے محبت کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کچھ لوگ بخت و اتفاق کے سہارے بڑے آدمی ہو گئے ہیں، پھر میں کیوں نہیں ہو سکتا مگر بخت و اتفاق سے دنیا کے مسائل تو حل نہیں ہوتے۔ راہ طلب میں اس پر کیا کچھ نہیں بیتی مگر ملکۂ تقدیر اس کے قبضے میں نہ آسکی۔ آخر میں اسے معلوم ہوا کہ جب تک عقل اس کی مدد نہیں کرے گی اسے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ طالب تقدیر کو راہ طلب میں جو مسائل پیش آئے ان میں سے بعض یہ ہیں: زراعت، تجارت، ملازمت یا سوداگری میں سے کون سا پیشہ اختیار کرنا چاہئے اور کیوں۔ تعلیم و تربیت کی سماج میں قدر و قیمت کیا ہے اور اس کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے۔ انگریزوں سے ہم کیا اور کتنا سیکھ سکتے ہیں، توہمات سے نجات پانے کا کیا طریقہ ہے، اس کا کیا سبب ہے کہ اب ہندوستان میں نہ تو کوئی نیا ہنر اختراع کیا جاتا ہے اور نہ علم کی نئی نئی راہیں نکالی جاتی ہیں۔

کریم الدین کوئی بڑے فن کار نہیں تھے، ان کی تصنیفات اور تالیفات درسی ضروریات پوری کر سکتی ہیں، ان کے اس قصے میں فکر و فن کی وہ پختگی نہیں ملتی جو نذیر احمد کے ناولوں کی جان ہے۔ پھر بھی ان کا یہ کارنامہ اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ داستانوں اور نذیر احمد کے ناولوں کی درمیانی کڑی ہے۔ قصہ نگاری میں مولوی کریم الدین ڈپٹی نذیر احمد کے پیش رو تھے۔ مولوی کریم الدین کی بنیاد پر ڈپٹی نذیر احمد نے عمارت کھڑی کی۔ خلاصے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے افسانوی ادب میں مغربی اقتدار کے زیر اثر جو تبدیلی ہوئی ہے، اس کا اولین نمونہ مولوی کریم الدین کی خط تقدیر ہے، ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس نہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر محمد حسن، پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا